علامہ اقبال پر فراقؔ کا ایک مضمون

پروفیسر علی احمد فاطمی

تلخیص: فراق گورکھپوری نہ صرف ایک اچھے شاعر تھے؛ بلکہ شاعری کی تنقید کا بھی ایک مخصوص تصور رکھتے تھے۔ جہاں وہ میر اور غالب کو مانتے تھے، وہیں اقبال کے تعلق سے نظریاتی اختلاف ضرور تھا۔ انصاف کا معاملہ یہ ہے کہ اگر اقبال کی شاعری کے بعض عناصر سے فراق کو اختلاف ہے تو خود فراق کی شاعری میں بھی وہی عناصر موجود ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ بعض سوالات جو کہ فراق نے اقبال کی شاعری کے حوالے سے اُٹھائے ہیں، غیر ضروری معلوم ہوتے ہیں۔

کلیدی الفاظ: اقبال، وطن پرستی، اسلامیات، مذہبی تحریک، مسلم بیداری، ایشیائی بیداری

میں فراق گورکھپوری کو بہت قریب سے جانتا ہوں۔ کئی برس ان کی خدمت میں گزارے ہیں۔ کئی مضامین بلکہ ایک مکمل کتاب لکھنے کے باوجود فراق کی شاعری اور اس سے زیادہ شخصیت کے کئی ایسے پہلو ہیں جن پر گفتگو نہیں کی جا سکی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بڑی شخصیت کے بعض کمزور پہلو بھی بڑے اور دلچسپ ہوتے ہیں۔ فراق صاحب میں بھی تھے۔ اچھی بات یہ تھی کہ وہ چھپاتے نہ تھے جیسے جوش، مجاز، منٹو وغیرہ کھلے کھلے سے تھے۔ کوئی مصلحت نہیں، کوئی ریاکاری نہیں لیکن کبھی کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ ایسے کھلے ہوئے انسان میں بھی نفسیاتی پیچیدگیاں ہوا کرتی ہیں اور وہ اس پیچیدگی کا برملا کبھی مفکرانہ اور کبھی فن کارانہ طور پر اظہار بھی کرتے رہتے ہیں کہ بڑے فن کاروں کی غلطیاں بھی دلچسپ اور معنی

خیز ہوا کرتی ہیں۔ کبھی کبھی اس طرح کی نامناسب حرکتیں کر کرے وہ اس سماج اور معاشرہ کا مذاق اڑاتے ہیں یا انتقام لیتے ہیں جس نے ان کے ساتھ اچھے سلوک نہیں کیے۔

فراق کی تنقیدی کتابوں اور مقالوں کو پڑھتے ہوئے کئی بار میرے لیے ذہن میں خیال آیا کہ ان کے زیادہ تر مضامین صف دوئم کے شاعروں پر ہی کیوں ہیں مثلاً: حالؔی، مصحفؔی، ذوقؔ وغیرہ۔ وہ اپنی گفتگو میں بھی اکثر جلیل مانکپوری، آسی غازی پوری، نوح نوروی وغیرہ کے اشعار پڑھتے اور لطف لیتے۔ ہر چند کہ ذوق مصحفی پر لکھے گئے مضامین بے حد عمدہ اور لائق مطالعہ ہیں تاہم یہ خیال تو آتا ہی ہے کہ جو شخص میر تقی میر سے اس قدر متاثر ہے اور کہتا ہے کہ ''ان غزلوں کے پردے میں تو میر کی غزلیں بولے ہیں۔'' لیکن تنقید کی سطح پر اُنھوں نے میرؔ پر کوئی قابل قدر مقالہ نہیں لکھا۔ غالبؔ سے بے حد متاثر تھے اور کہتے تھے کہ غالبؔ بڑا پاجی شاعر ہے اور پھر عمدہ اور بڑی شاعری کے لیے ''پاجی'' کو لازمی قرار دیتے ہوئے دیر تک گفتگو کرتے لیکن پھر بھی وہ غالب پر کوئی قابل مطالعہ مقالہ نہ لکھ سکے۔ ایک معمولی سا مقالہ ملتا ہے۔ لیکن وہ واقعی معمولی ہے جو فراق کا لگتا ہی نہیں ہے۔

اس ضمن میں سب سے نازک اور پیچیدہ مسئلہ اقبالؔ کو لے کر تھا۔ اقبالؔ، میرؔ و غالبؔ کے مقابلے زمانی اعتبار سے فراق کے زیادہ قریب تھے۔ جس وقت فراق نے ہوش وحواس کی آنکھیں کھولیں اور شاعری میں اقبال کی نظمیہ شاعری کا طوطی بول رہا تھا۔ فراق اگرچہ غزل کے شاعر تھے اور اُن پر میر سے لے کر حسرت تک کی غزلیہ شاعری کی روایت، امیر مینائی کی غزلیت، فانی کی یاسیت، یگانہ کی نزاعیت، حسرت موہانی کی مقبولیت کے اثرات تھے۔ لیکن فراق نرے شاعر نہ تھے۔ وہ انگریزی کے پروفیسر تھے، مفکر اور دانشور بھی تھے۔ نہایت سنجیدگی سے حیات وکائنات پر نظر رکھتے تھے۔ تاریخ وتہذیب کا مطالعہ کرتے تھے۔ اُن کے بارے میں ایک رائے بھی رکھتے تھے۔ شعر و ادب کے حوالے سے بھی اظہار کرتے تھے۔ ایسی صورت میں اُنھیں اقبال کیوں پسند نہ آتے۔ اُنھوں نے اقبال پر کوئی فکر انگیز اور معنی خیز مقالہ نہیں لکھا بلکہ اکثر وہ اقبال کے حوالے سے منفی اور ناپسندیدہ گفتگو کرتے بلکہ مذاق ہی اڑاتے۔ ایک بار راقم نے فراق کو یونی ورسٹی کے ایک جلسے میں بہ طور مہمان مقرر مدعو کیا۔ پندرہ اگست کی تقریب تھی، جب میں فراق صاحب کو لے کر یونی

ورسٹی کے احاطے میں داخلی ہوا تو یوم آزادی کی مناسبت سے اقبال کا نغمہ ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا'' لاؤڈ اسپیکر پر بج رہا تھا۔فراق نے اُسے سنتے ہی عجیب سا منھ بنایا۔پھر اپنی تقریر کا آغاز یوں کیا۔:

> ''سچ بات یہ ہے کہ ہندوستان سارے جہاں سے اچھا ہرگز نہیں ہے۔اگر یہ اچھا ہے تو پھر برا ملک کون ہے۔یہ وہ ملک ہے جہاں جمہوریت قے کر رہی ہے۔ہم کو اسی طرح کے سستے جذبات نے مار رکھا ہے۔جن کو کائنات کی فکر نہیں ہوتی ہے اُنھیں وطن پرستی کا ہیضہ ہو جاتا ہے۔''

ملاحظہ کیجیے آزادی کے دن اس قسم کی گفتگو کرنے کا کیا تک تھا۔لیکن اُنھیں اقبال کی مذمت کرنی تھی اس لیے تک یا بے تک کی اُن کے نزدیک کوئی اہمیت نہ تھی اور وہ بڑے بڑے جلسے و مذاکرے خراب کر دیا کرتے تھے۔بعد میں میں نے اس کی شکایت کی تو بولے۔

> ''یہاں تم مسلمان ہو اور اقبال اسلامی فکر کا شاعر ہے اس لیے تم کیا ساری مسلم قوم اقبال کے تعلق سے جذباتی ہو جاتی ہے لیکن ذرا سوچو یہ کوئی شاعری ہے ''بحر ظلمات میں دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے'' یہ شاعری میں ایکے گھوڑے کا کیا کام۔''

اور پھر وہ شروع ہو جاتے اور نہ جانے کہاں کہاں تک چلے جاتے۔

یہاں مجھے ان کے ایک مضمون سے متعلق گفتگو کرنی ہے جس کا تعلق اقبال سے ہے۔میرا اب تک خیال تھا کہ اُنھوں نے اقبال پر کوئی مضمون نہیں لکھا۔اُن کے شاگرد اور ممتاز ترقی پسند ادیب و ناقد پروفیسر سید محمد عقیل سے دریافت کیا تو اُنھوں نے بتایا کہ ایک بار ضرورت کے تحت اُنھوں نے انگریزی میں اقبال پر مضمون لکھا اور عقیل صاحب کو دیا کہ اسے دیکھ لو کوئی غلط بات تو نہیں جا رہی ہے۔یہ بات بہت پرانی ہے لیکن اُن کا خیال یہی تھا کہ فراق نے اقبال پر اردو میں کوئی مضمون نہیں لکھا۔درمیان میں ڈاکٹر تسکینہ فاضل کی

کتاب ''اقبال اور اُن کے معاصر شعرا'' میں یہ تذکرہ ملتا ہے کہ ۱۹۷۷ء میں آجکل کے اقبال نمبر میں فراق کا ایک مضمون بہ عنوان ''اقبال کے متعلق خوش فہمیاں'' شامل ہے۔ اب یہ نمبر نایاب ہے۔ ادھر اپنی ذاتی لائبریری کی چھان بین کرتے ہوئے رسائل کے اوراق اُلٹتے ہوئے مجھے بلراج ورما کے رسالہ ''تناظر'' ۱۹۸۰ء میں اقبال پر لکھا ہوا مضمون بہ عنوان ''اقبال کے داخلی محرکات'' دستیاب ہوا۔ میں حیران ہوا اور خوش بھی کہ اقبال پر فراق کے دو مضامین ہو گئے۔ استاذی سید محمد عقیل سے ذکر کیا تو وہ بھی خوش ہوئے۔ اُن کا خیال تھا کہ یہ اسی انگریزی مضمون کا ترجمہ ہے۔ بعد میں تسکینہ فاضل ہی کی کتاب سے علم ہوا کہ یہ وہی مضمون ہے جو بعد میں دوسرے عنوان کے ساتھ ''تناظر'' میں شائع ہوا۔ وہ لکھتی ہیں۔:

> ''۱۹۷۷ء کے رسالہ ''آجکل'' کے اقبال نمبر میں اُنھوں نے کو مضمون ''اقبال کے متعلق خوش فہمیاں'' کے عنوان سے لکھا تھا وہی مضمون ''تناظر'' میں جنوری ۱۹۸۰ء میں دوسرے عنوان ''اقبال کے داخلی محرکات'' کے عنوان سے شائع ہوا۔''

مضمون کے عمدہ ہونے میں شبہ نہیں، لیکن یہ بھی ہے کہ اس مضمون میں فراق کے علم و شعور اور منفرد زاویۂ فکر کے ساتھ ساتھ وہی نفسیاتی پیچیدگی ظاہر ہوتی ہے جو اقبال کو لے کر ہمیشہ اُن کے دل و دماغ میں چھائی رہی جسے Complex کے علاوہ کچھ اور انہیں کہا جا سکتا ہے اور یہ سچ ہے کہ اقبال کی عظمت اور شہرت بڑے بڑوں کے لیے Complex تھی۔ بعد کے شعرا میں کون ہے جو اُن سے متاثر ہوا، پہلے یا بعد میں سبھی نے اعتراف کیا۔ فراق نے کبھی اعتراف نہیں کیا لیکن نظموں کی سطح پر وہ بھی لاشعوری طور پر متاثر ضرور ہوئے؛ اس پر گفتگو کی جا سکتی ہے لیکن اس وقت میں اُن کے نایاب اور بحث طلب مضمون پر چند باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں۔ مضمون کا آغاز ان جملوں سے ہوتا ہے۔:

> ''میں ساٹھ برس مسلسل یہ محسوس کرتا ہوں کہ دنیا کی قدیم سے قدیم شاعری سے لے کر آج تک کی شاعری جو کئی زبانوں پر مشتمل ہے اس کا اونچا سے اونچا لہجہ اور اس کی بلندی سب کچھ اقبال کے

اردو اور فارسی کلام میں مل جاتی ہے اور دنیا کے بڑے بڑے شاعروں کے یہاں جو خوبیاں ہیں وہ اقبال کے یہاں بھی موجود ہیں لیکن دنیا کا اور اس زمانے میں کسی بھی ملک کا خواہ وہاں کے باشندے مسلمان ہوں یا غیر مسلم ہوں سیاسی انتظام، اقتصادی انتظام، صنعت وحرفت، تجارت وترقی اور اُن کے تعلیمی نظام، بین الاقوامی مسائل کے حل اور اسی طرح کے کئی سوالات جو ہماری زندگی اور موت کے سوالات ہیں۔ اُن اہم ترین معاملات پر آج ہماری رہنمائی دنیا بھر کی شاعری نہیں کرسکتی۔''

فراق صرف اقبال کا ہی نہیں دنیا بھر کے بڑے مفکرین وشعرا کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اُن کے خیالات تھوڑی بہت رہنمائی تو کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود تاریخ و تہذیب نے جہاں دنیا کو لا کھڑا کر دیا ہے وہاں آج بھی اصلاح کی ضرورت ہے۔ پھر وہ کچھ بڑے شعرا کا نام لیتے ہیں جن میں اقبال بھی شامل ہیں۔ دیگر شعرا میں غالب، عرفی، سعدی، حافظ، شکسپیئر، کالی داس وغیرہ کے حوالے سے کہتے ہیں کہ یہ سب ایک طرف، دوسری طرف تمام مفکرین اور سیاست دان اور دیگر علوم کے ماہرین۔ ان سب کے ہوتے ہوئے بھی دنیا خطرناکی کی طرف بڑھتی جارہی ہے۔ یہ ایک طرح سے مضمون کی تمہید ہے جس میں پس پردہ مقصدی شاعری یا سماجی اور اصلاحی شاعری کی بے وقعتی ظاہر کی گئی ہے۔ ایسا اس لیے کیا گیا ہے کہ آگے چل کر اُنھیں اقبال اور اُن کی فکری و اصلاحی شاعری کو گھیرے میں لینا ہے۔ اس تمہید کے فوراً بعد وہ ایک چبھتا ہوا سوال کرتے ہیں جو براہ راست اقبال سے ٹکراتا ہے۔ سوال ہے۔:

''مغربی تہذیب وتمدن کے متعلق حکم تو لگا دیا کہ تمہاری تہذیب اپنے ہاتھوں سے آپ ہی خودکشی کرے گی لیکن اس خطرناک حالت سے بچنے کے لئے اُن کے پاس کیا کیا نسخے ہیں۔ کیا معجزہ نما اکسیر یا تریاق ہیں۔ اس طرف اقبال نہ کوئی مجمل اشارہ کرسکے کہ مفصل۔

اور یہ سمجھنا کہ دنیا بچنے یا مٹنے کی کوئی چھ منتر دوا یا سچائی اقبال کے پاس ہے یا اُن کے کلام میں ہے۔ یہ ایک خوش فہمی اور خوش اعتقادی کے سوا کچھ نہیں۔''

اشاریت صداقت میں تبدیل ہوگئی اور اقبال کے تئیں فراق کی ذہنیت بھی کھل کر سامنے آ گئی۔ یہ بات کوئی غیر شاعر کہتا تو اتنا عجیب نہیں لگتا لیکن فراق خود ایک عمدہ اور اہم شاعر ہیں اور شاعری کے اسرار و رموز اور اس کے تخلیقی و تخیلی عمل پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ وہ اس طرح کی گفتگو کریں تو حیرت ہوتی ہے۔ ہم سب واقف ہیں کہ شاعر، شاعر ہوتا ہے حکیم نہیں ہوتا کہ مرض کی تشخیص کی اور نسخہ لکھ دیا۔ شاعر حقیقت سے زیادہ تخیل و تصور کی دنیا میں جیتا ہے۔ سماجی اور انسانی وابستگی اُسے ایک ایسی دنیا میں ضرور لے جاتی ہے جہاں وہ اچھے انسان اور صحت مند معاشرے کا خواب دیکھتا ہے اور پھر بالواسطہ یا بلاواسطہ وہ اُن خوابوں اور آرزوؤں کو اشاروں کنایوں میں اپنی شاعری میں پیش کرتا ہے۔ وہ نسخہ نہیں بلکہ خواب پیش کرتا ہے۔ تصور میں بنائی ہوئی تصویر کے عکس پیش کرتا ہے کہ خواب دیکھنا انسان کا فطری عمل ہے اور خوابوں کا ٹوٹنا ایک سماجی عمل۔ خود فراق اپنی شاعری میں بالخصوص نظمیہ شاعری میں ایک اچھے معاشرہ اور خوبصورت دنیا کا خواب دیکھتے ہیں۔ اسے بدلنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس دھمکی آمیز لہجے تک پہنچ جاتے ہیں ''نہیں بدلی اگر دنیا تو دنیا کو ابھی بدلو'' یہ نظم کا نہیں غزل کا مصرعہ ہے۔ یا یہ اشعار۔:

تعمیر کریں گے نئی دنیا نئی دنیا
کمزوروں میں میں زورِ ہمہم بانٹ رہا ہوں
دنیا کو نئے دور کی دیتا ہوں بشارت
یا اک نئی تقدیرِ اُمم بانٹ رہا ہوں
اے اہلِ ادب آؤ یہ جاگیر سنبھالو
میں مملکتِ لوح و قلم بانٹ رہا ہوں

کوئی سوال کر سکتا ہے کہ فراق دنیا کو کتنا بدل پائے۔ نئی دنیا کی تعمیر میں فراق کی شاعری کا کیا رول رہا۔ یا اس طرح کی نظموں مثلاً: نغمۂ حقیقت، دھرتی کی کروٹ وغیرہ

میں جو پیغام اور للکار ہے اس کے اثرات کہاں تک پہنچ پائے۔ جو الزام فراق اقبال پر لگا رہے ہیں وہی الزام خود فراق پر لگایا جا سکتا ہے۔ دراصل یہ الزام یا یہ خیال ہی مناسب نہیں کہ شاعر کے پاس کوئی نسخہ ہوتا ہے جو چٹکی میں دنیا کو بدل سکتا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ ایک سنجیدہ اور ذمہ دار شاعر معاشرہ کی خوبیوں و برائیوں پر طنز کر سکتا ہے۔ اچھے ماحول کے خواب دکھا سکتا ہے اور تبدیلی کے لئے فضا ہموار کر سکتا ہے۔ اس سے زیادہ کسی شاعر سے اُمید یا توقع لگانا بھی مناسب نہیں، خواہ وہ حالؔی جیسا اصلاحی شاعر ہو یا اقبالؔ جیسا پیغمبرانہ مزاج کا ہی شاعر کیوں نہ ہو۔ فراق نے کئی مضامین شعر و شاعری کی ماہیئت و مقصدیت پر لکھے ہیں جن میں صاف طور پر اس نوع کی باتیں کہی گئی ہیں۔ ایک مضمون بہ عنوان ''حقیقی شاعری کیا ہے'' میں کہتے ہیں۔ ''اگر عمل خواب نہ دیکھا جائے تو ساری دنیا بے عمل ہو جائے گی''۔ اقبال بھی یہی عمل کی ہی بات کرتے ہیں۔ اسی مضمون میں ایک جگہ اور فراق کہتے ہیں۔:

> ''موجودہ آسودگی سے احساسِ نا آسودگی بھی پیدا کریں۔ ایسی چیزو ں کو بھی تلاش کریں جو کار آمد ہونے کے ساتھ نشاط افروز بھی ہوں ۔۔۔ اس کی آرائش کا شعور حد بندی نہیں کرتا بلکہ اس کو بڑھانے کے کام آتا ہے۔۔۔ ایجاد کا خواب دیکھنا ان کا کام اور ایجاد کو عمل میں لانا دوسروں کا کام۔''

اب ذرا اقبال کے ایک ابتدائی مضمون قومی زندگی (مخزن ۱۹۰۴ء) کے چند جملے ملاحظہ کیجیے۔:

> ''نوع انسان کی موجودہ ترقی جیسا کہ واقعات سے معلوم ہوتا ہے کوئی سستے داموں کی چیز نہیں۔ سینکڑوں قومیں عملی اور تمدنی ترقی کی حسین دیوی کے لئے قربان ہوتی ہیں اور ہزاروں افراد کا خون اس خوفناک قربان پر بہایا جاتا ہے۔ جنگیں، وبائیں اور قحط اس ہمہ گیر قانون کے عمل کی تمام صورتیں ہیں اگر ان کو ارتقائے نوع انسانی

کے اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ واقعات جو بظاہر آفاتِ سماوی معلوم ہوتے ہیں طبقۂ انسانی کے لیے ایک برکت ہیں جس کا وجود نظام قدرت کی آراستگی کے لیے انتہا درجہ کا ضروری ہے۔ اس قانون کا اثر اقوام انسانی تک محدود نہیں بلکہ بزم ہستی کے کسی حصے کی طرف نگاہ کرو اس کا عمل جاری نظر آئے گا۔''

شاعری کے تعلق سے بھی اقبال ایک جگہ لکھتے ہیں۔:

''شاعری دراصل ساحری ہے اور اس شاعر پر حیف ہے جو قومی زندگی کے مشکلات میں دلفریبی کی شان پیدا کرنے کی بجائے فرسودگی وانحطاط کو صحت اور قوت کی تصویر بنا کر دکھادے اور اس طور پر اپنی قوم کو ہلاکت کی طرف لے جائے۔ اس کا تو فرض ہے کہ قدرت کی لازوال دولتوں میں سے زندگی اور قوت کا جو حصہ اُسے دکھایا گیا ہے اُس میں اوروں کو بھی شریک کرے نہ یہ کہ اُٹھائی گیر بن کر جو رہی سہی پونجی اس کے پاس ہے اُس کو بھی ہتھیالے۔''

مثالیں اور بھی ہیں اقبال کی اور فراق کی بھی لیکن یہاں اقبال کے حوالے سے بات فراق کی زیادہ کرنی ہے۔ اقبال پر لکھے گئے اس مضمون میں فراق قدم قدم پر سوالات قائم کرتے ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں۔:

''اقبال کا وہ کون سا فلسفہ ہے یا کون سی حقیقت کی ترجمانی کی ہے جس پر انسانیت تکیہ کر سکے یا جہاں گمراہ انسانیت پناہ لے سکے۔''

یا

''اقبال کی ملت زدگی یا جنونِ ملت اور اس کے ساتھ ساتھ انسان دوستی کا دعویٰ دو دل پن کا شکار ہو کر رہ گیا ہے۔ اقبال کی فکری شخصیت باہم متضاد قوتوں کا شکار ہو کر رہ گئی ہے جسے انگریزی میں

Split Personality کہتے ہیں۔''

ایک طرف اگر یہ الزامات تو دوسری طرف یہ بھی کہتے ہیں۔:

''وہ ایک طرف تو وحدتِ انسانی کے قائل تھے اور دل سے قائل تھے اور دوسری طرف ملت زدہ تھے۔ جب اُنھوں نے ہوش سنبھالا تو سوامی رام تیرتھ، سوامی وویکا نند، اربندگھوش اور اُن کے پہلے رام موہن رائے کی تعلیمات اور مہاتما گاندھی کی شخصیت نے جو عالم گیر کشش رکھتی تھی اس سے بھی کچھ شعوری اور کچھ نیم شعوری طور پر برابر اثر لیا۔ ٹیگور کے یہاں جو وحدت انسانی کا زبردست عنصر ہے اسے بھی اپنے آپ کو ہم آہنگ پاتے تھے۔ مغرب کے مستشرقین نے بھی اُن کے اندر احساس کو جھنجھوڑ کر جگایا تھا۔''

یہ باتیں اقبال کے حق میں جاتی ہیں جس کا اعتراف فراق کرتے ہیں کہ اقبال دنیا بھر کے اُن عالموں اور علوم سے متاثر تھے جو وحدتِ انسانی کو تقویت پہنچاتے ہیں پھر تحسین کا یہ عمل تنقیص اور تضحیک میں کیسے بدل گیا۔ شاید فراق کے دل کا چور یہ ہے کہ ان سب باتوں کے ہوتے ہوئے اقبال نے ان خیالات کو اسلام سے کیوں جوڑا۔ اور یہ کیوں ثابت کرتے رہے کہ اسلام میں انسان دوستی اور مساوات کے وہ سارے عناصر موجود ہیں جس پر علمائے کائنات زور دیتے رہے۔ بادی النظر میں فراق کا الزام درست بھی ہوسکتا ہے لیکن اقبال کے سلسلے میں درست نہیں کہ وہ پوری ایمانداری اور سادگی سے اپنے آپ کو مسلمان اور اسلام کا پیروکار کہتے ہیں۔ اور یہ کوئی ایسی غلط بات بھی نہیں۔ تلسی داس نے بھی انسانیت کی بات کہی اور انسانیت کے اعلیٰ اقدار کو ہندو مذہب میں تلاش کرتے رہے۔ ہندی کی بھکتی شاعری جو ایک اعلیٰ انسانی اقدار کی شاعری ہے اس کا بڑا حصہ ہندو مذہب کے افکار و اقدار پر ٹکا ہوا ہے جو کسی طرح سے غلط نہیں۔ اسی طرح سے نجانے کتنے مغربی شعرا عیسائیت میں پناہ لیتے ہیں۔ ملٹن جس کی عمدہ مثال ہے۔ اگر یہ سب اپنے اپنے مذہب کے حوالے سے عالم انسانیت کی بات کرتے ہیں تو کیا غلط کرتے ہیں اور اقبال

کہاں سے غلط ہیں۔ اتنا ہی اس غلطی کو فراق ایک اور جامہ پہنا کر کہتے ہیں کہ اتنا بڑا شاعر محض ملت اسلامیہ کو ہی بیدار کرنے میں کیوں مصروف ہے۔ یہ یا وہ اور ہندو تصورات ہمیں یہ سکھاتے ہیں ''یہ بھی اور وہ بھی'' اور آج اسی کو ہم بقائے باہم کہتے ہیں لیکن اس سے زیادہ بحث طلب اور اس کا بھی احساس ہوتا ہے کہ فراق نے مکمل اقبال کو پڑھا اور نہ سمجھا ہے نیز ایک طے شدہ ذہنیت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اسی وجہ سے تسکینہ فاضل کو یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہ ہوا ''فراق نے اقبال کو دیکھا ہے اور دور ہی سے دیکھا ہے۔ ان کے کلام کا مطالعہ کیا ہے لیکن اقبال پر فراق کی تحریروں سے یہ مطالعہ سرسری معلوم ہوتا ہے۔ علی سردار جعفری نے اقبال شناسی کی ابتدا میں لکھا ہے۔:

> ''چوں کہ اقبال نے اپنی شاعری میں اسلامی فکری روایت اور استعارات کا استعمال زیادہ کیا ہے اور قوم پرستی (نیشنلزم) کو سیاسی سطح پر قبول نہیں کیا اس لیے بعض لوگوں نے اُن پر فرقہ پرستی کا الزام لگا دیا جو اس عظیم شاعر کی توہین ہے۔ اقبال کے یہاں جب الوطنی ایمان کا درجہ رکھتی ہے۔ ان کی شاعری میں سامراج دُشمنی کی لے شعلہ نوائی کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ ہندوستان کی آزادی کا جذبہ خون بہار کی طرح ان کے اشعار میں رواں دواں ہے۔ وہ انسان کی روحانی اور اخلاقی ترقی کے خواہاں تھے اور انسانی تخلیقی قوتوں کے مداح اور قصیدہ خواں تھے۔ ایسا شاعر فرقہ پرستی کے تنگ دائرے میں سانس نہیں لے سکتا۔''

فراق اقبال کو فرقہ پرست تو نہیں کہتے اور اُن کی کئی خوبیوں اور صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہیں۔ یہ فراق کی مجبوری ہو سکتی ہے اور فکر و نظر کی دوری بھی جیسا کہ ایک جگہ آل احمد سرور نے بھی لکھا ہے۔ ''وہ (فراق) فکر اقبال سے اپنے آپ کو ہم آہنگ نہیں کر سکے۔'' فراق اقبال کے اسلامی خیال کی شاعری کے قائل کیوں نہیں ہو پائے اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ وہ ہندوستانی ادب (جس میں ہندو فکر زیادہ شامل ہے) اور ہندوستان کی

تہذیب کے دلدادہ تھے۔ ہندو کلچر سے اُن کی وابستگی، جنسی آزادی اور آزادہ روی کے پیش نظر وہ اقبال سے اپنی فکر کو ہم آہنگ نہیں کر پائے۔ اسی سبب وہ اقبال کے افکار سے اختلاف کرتے رہے اور اُن کی آزاد پسند طبیعت کی بندش کو قبول نہیں کر سکتی تھی۔ فراق کو اقبال سے اختلاف تو کرنا ہی تھا چنانچہ اسی پس منظر میں وہ اپنے اس مضمون میں جا بجا اس نوع کے سوالات واعتراضات کرتے ہیں۔ ملاحظہ کیجیے۔:

''اقبال کی فکر تضاد و تصادم کا شکار ہو کر رہ گئی ہے۔ اقبال کی فکریات میں یہی نہیں کہ کوئی فکر نہیں ہے البتہ مختلف نظریوں کی ہم آہنگی دریافت کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔''

پھر یہ بھی کہتے ہیں۔:

''میں نے کھلے دل سے اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ اقبال نے مسلم یا غیر مسلم دنیا کے بڑے سے بڑے شاعروں کی صف میں بیٹھ کر بلند آہنگ سے بلند آہنگ شاعری کی ہے۔''

ہوسکتا ہے یہ تعریف ہو لیکن فراق عمدہ اور بڑی شاعری کے لیے جس طرح کی نرم گفتاری، لطیف سرشاری کو ضروری سمجھتے ہیں اور کہیں کہیں وجدانی اور ہیجانی کیفیت کو بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ ایسے میں وہ اقبال کی بلند آہنگی کو وہ کس طرح پسند کر سکتے ہیں۔ حالاں کہ ایک مضمون ''اردو غزل کی تکنیک'' میں وہ یہ اعتراف کرتے ہیں ''غزل کے میدان میں اقبال کا کلام انقلاب کا حکم رکھتا ہے۔ مجہولیت کی روایتوں کو اقبال نے جڑ سے اکھاڑ دیا۔'' تو فوراً یہ بھی کہتے ہیں ''لیکن اقبال کی عملیت یا ترقی پسندی Idealistic ہے۔ دنیا کی پرولتاری قوتوں کا اُبھار موجودہ تاریخ کا سب سے اہم باب ہے، اقبال میں اس انقلاب کی آہٹ نہیں پا سکتے تھے۔'' اقبال کے تعلق سے اس طرح کے اعتراضات اُنھوں نے ''من آنم'' کے خطوط میں بھی کئے ہیں جن پر ایک الگ سے مضمون کی ضرورت ہے۔ یہاں میں اس بلند آہنگی کی بات کرنا چاہتا ہوں جو وہ اقبال کے یہاں پاتے ہیں، پسند کرتے ہیں اور ناپسند بھی کرتے ہیں لیکن جب شعر و شاعری کی حقیقت کی بات کرتے

ہیں تو اس کے برعکس ایسی ایسی اصطلاحیں استعمال کرتے ہیں جن کے معنی ومطالب بعید از فہم ہوتے ہیں اور جن میں اکثر انگریزی اصطلاحوں کی بھیڑ رہتی ہے۔ خیر یہ بحث پھر کبھی۔ فراق جیسے مفکر شاعر کو معلوم ہے کہ شاعری کے تقاضے کلیتاً نرم گرفتاری کے حق میں نہیں جاتے۔ عمدہ اور بڑی شاعری اپنا ارتقائی اور فکری سفر محض فریاد اور آہ وزاری کے ذریعہ طے نہیں کرتی بلکہ کبھی کبھی مزاحمت، احتجاج اور للکار کے ذریعہ بھی آگے بڑھتی ہے۔ فراق نے انگریزی کی رومانی خوب پڑھی اور سمجھی ہے تو وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ اس نوع کی رومانی شاعری کے پس پردہ انقلاب فرانس کی ہلچل تباہی اور بربادی کام کر رہی ہے۔ ورڈسورتھ سے کسی نے پوچھا کہ آپ اس قدر عمدہ رومانی شاعری کس طرح کر سکے تو جواب میں اُنھوں نے انقلاب فرانس کا نام لیا اور نئے انسان اور نئے معاشرہ کے خواب کی باتیں کیں۔ جس طرح زندگی میں صرف دن نہیں رات بھی ہے۔ خاموش نہیں شور وغل بھی ہے۔ آرام نہیں تکلیف بھی ہے، اُسی طرح شاعری میں بھی یہ سارے متضاد عناصر اپنے اپنے انداز سے فن کاری کے ساتھ جذب و پیوست ہوتے ہیں۔ ہر عنصر کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں اور مطالعے بھی۔ عشقیہ شاعری کو احتجاجی رنگ میں پیش نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح انقلاب کی باتیں سرگوشی میں نہیں کی جاسکتیں۔ وہاں بلند آہنگی ہی اس کا وصف ہے، جوہر ہے۔ دراصل ہم خلوت کے اس قدر عادی رہے ہیں کہ جلوت کی شاعری ہمیں پسند نہیں آتی ہے حالاں کہ دنیا کی بڑی شاعری میں خلوت کم جلوت زیادہ ہے اور جو خلوت ہے، ذات ہے، تنہائی ہے وہ بھی خارجی اسباب اور اُس کے دباؤ و جبر کے تحت وجود میں آتی ہے۔

جس تضاد کو فراق اقبال کے یہاں تلاش کر رہے ہیں وہ ہر شاعر کے یہاں ہوتا ہے کیوں کہ وہ شاعر کی نہیں زندگی کا تضاد ہوتا ہے اور اسے عیب نہیں سمجھا جا سکتا کہ واقعات، حیات اور واردات ذات خود تضادات اور تصادمات سے پُر ہیں۔ خود فراق کی شاعری میں تضادات ہیں۔ غزل کے مترنم، نشاط انگیز بلکہ وصل آمیز شاعر کی اس شاعری کو ہم کس خانے میں رکھیں گے۔

فرقوں کے مٹانے سے مٹے ہیں نہ مٹیں گے

آفاق زمانہ سے جھکے ہیں نہ جھکیں گے
اُبھرے تو دبانے سے دبے ہیں نہ دبیں گے
ہم موت کے مارے بھی مرے ہیں نہ مریں گے
ہم زندہ تھے ہم زندہ ہیں ہم زندہ رہیں گے

(داستان آدم)

ہل، کدال، پھاوڑے، بسولے
پنڈت، ٹھاکر، شیخ اور سید
اُٹھے ہتھوڑے بول اُٹھیں گے
صاحب، مسٹر، حاکم، افسر
نیا جنم ہے آزادی کا
سونا والے چاندی والے
دیش کے راجہ دیش نواسی
آڑھت والے، منڈی والے
پرجہ ہی ہیں دیش کا راجہ
کوٹ محل اور کوٹھی والے

(دھرتی کی کروٹ)

شاعری میں ایکے، گھوڑے پر اعتراض کرنے والے شاعر کی شاعری میں آڑھت، منڈی، ہل، کدال، ہتھوڑا وغیرہ استعمال ہوا ہے۔ یہ سب اس لیے نہیں کہا جا رہا ہے کہ فراق کی شاعری خراب ہے یا اُن کا اعتراض غلط ہے۔ دراصل بات یہ ہے کہ فراق شاعری کے پیمانے غزل کے حوالے سے بناتے ہیں جب کہ نظم کے تقاضے کچھ اور ہوتے ہیں۔ غزل کے مقابلے نظم کا رنگ و آہنگ مختلف ہوتا ہے اور اس کے موضوعات بھی مختلف ہوتے ہیں۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ موضوعات کا جس قدر تنوع نظم میں ہے غزل میں نہیں۔ آل احمد سرور نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ اردو شاعری کی ترقی جس قدر نظم سے وابستہ ہے غزل سے نہیں۔ خیر اس پر بحث ہو سکتی ہے لیکن اس امر میں بحث کی گنجائش کم سے کم ہے

کہ زندگی کی ارضی رنگا رنگی، بوالعجبی اور تہہ داری کی عکاسی جس طرح نظم میں ممکن ہے غزل میں شاید نہیں کہ زندگی صرف نرم روی کا نام نہیں۔ یہاں روانی ہے، جوانی ہے اور کہانی بھی۔ فراق کا ہی شعر ہے۔:

رات بھی، نیند بھی کہانی بھی
ہائے کیا چیز ہے جوانی بھی

اسی غزل میں ایسے اشعار بھی ہیں۔:

ایک پیغام زندگانی بھی
عاشقی مرگِ ناگہانی بھی
دل کو شعلوں سے کرتی ہے سیراب
زندگی آگ بھی ہے پانی بھی
وضع کرتی ہے کوئی نئی دنیا
کہ یہ دنیا ہوئی پرانی بھی

دیکھیے غزل کے اشعار میں آگ اور شعلوں کی بات ہوگئی ہے۔ نئی دنیا کے وضع کرنے کے حوصلے بھی آ گئے۔ ایسے میں فراق کا یہ خیال کہ شاعری صرف شبنمی احساس کا نام ہے۔ لطیف سرشاری اور وجدانی کیفیت کا نام ہے کہاں تک درست ہے۔؟ یہ تخلیقی نوعیت کے خوبصورت جملے تو ہو سکتے ہیں لیکن شاعری کی اصل تنقید و تعریف، ماہیت و مقصدیت سے میل نہیں کھاتے، اُن کی تاثراتی تنقید میں اس قسم کے جملے نظر آتے ہیں۔:

''غالب بڑا پاجی شاعر ہے''
''حالی بڑا نیک دل شاعر ہے''
''مصحفی بڑ چوٹیلہ شاعر ہے''

ظاہر ہے کہ یہ تاثراتی اور جذباتی نوعیت کے جملے ہیں، ان کا لطف تو لیا جا سکتا ہے لیکن ان کی گہرائی میں اُترا نہیں جا سکتا کیوں کہ ان میں گہرائی ہے ہی نہیں۔

جیسا کہ عرض کیا گیا کہ فراق کی غور و فکر ایک نفسیاتی پیچیدگی سے ملوث ہے۔ زندگی کے پیچ و خم اور کیف و کم نے جہاں کچھ دنیا کو دیکھنے کے عناصر دیئے اس سے زیادہ خود نگری

اور خود پرستی کے عناصر سے بھی مالا مال کر دیا۔ فراق کی ذاتی زندگی میں اور ادبی زندگی میں بھی اس کے اثرات دیکھے جا سکتے ہیں۔ اُن کا یہ مسئلہ تو تھا کہ اُن کو اپنے علاوہ کوئی بھی بڑی شخصیت مشکل سے پسند آتی تھی۔ اگر ایک طرف وہ ٹیگور، اقبال، گاندھی وغیرہ پر معترض ہوئے تو دوسری طرف اپنے بارے میں شاعری میں یہ بھی کہا۔

''نماز شاعری ہے اور امامِ فن فراق ہے''

''اس دور میں اقلیمِ سخن کا وہ شہنشاہ''

غالب و میر و مصحفی

ہم بھی فراق کم نہیں

اسے آپ شاعرانہ تعلّی یا مبالغہ سے تعبیر کر سکتے ہیں اور یہ غزل کی روایت بھی ہے کہ غزل اشعار میں خاص طور پر مقطع میں اکثر مبالغہ پایا جا سکتا ہے۔ اس لیے فراق کے یہاں بھی ہے لیکن اس کے برعکس اقبال کی شاعری میں اس قسم کی ذاتی تعریف و تحسین نہ کے برابر ملے گی بلکہ جا بجا اُنھوں نے اپنی خاکساری، انتشار ذہنی کا اعتراف کیا ہے۔ اپنے آپ کو شاعر ہی نہیں تسلیم کیا ہے اور شاعری چھوڑ دینے کا قصد بھی کیا ہے۔ اقبال کی ایسی تحریریں ان کے صوفیانہ اور بے نیازانہ رویوں کی غماز ہیں۔ اس کے برعکس فراق ہمیشہ اپنی ذات اور حالات کے تئیں سنجیدہ اور حساس رہے۔ نام و نمود کے طلب گار رہے۔ یہ ایسے حقائق ہیں جو کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ وہ ایک خاص مزاج کے حامل تھے۔ اُن کی اپنے بڑوں سے ہی نہیں بلکہ ہم عصروں مثلاً جوشؔ، حسرتؔ وغیرہ سے ٹھنی رہتی۔ چھوٹوں مثلاً فیضؔ، مجازؔ وغیرہ کی مقبولیت بھی اُنھیں پسند نہ آتی تھی۔ عام گفتگو میں سردارؔ، مخدومؔ وغیرہ کا مذاق اُڑاتے۔ سب جانتے ہیں کہ الہ آباد میں فراق، سجاد ظہیر، اعجاز حسین وغیرہ کے ساتھ مل کر انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد ڈالنے والوں میں سے تھے لیکن بعد میں وہ اسی انجمن کا تماشا بناتے رہتے۔ ''من آنم'' کے خطوط ملاحظہ کیجیے جا بجا اشتراکیت کے اثرات قبول کرنے کے اعترافات ملیں گے لیکن بعد میں اسی اشتراکیت کی مٹی پلید کرتے رہے۔ ہندی کے شعرا خاص طور پر الہ آباد کے ہندی شعرا کا تو ناطقہ بند کئے رہتے کہ اسی بہانے وہ اخبار کی سُرخیوں اور تذکروں میں بنے رہتے۔ ایسا وہ جان بوجھ کر کرتے۔ میں ان سب

چیزوں کو ان کی نفسیاتی پیچیدگی کے حوالے سے دیکھتا ہوں جس نے ان کی شخصیت میں گرہیں لگا رکھی تھیں اور ایک کجی پیدا کر دی تھی، پھر بھی ان کی شاعرانہ عظمت سے کون انکار کر سکتا ہے اور مجھے فخر ہے کہ میں نے اپنی زندگی کے چند برس ان کی معیت میں گزارے اور ان سے بہت کچھ سیکھا۔ عرض مدعا یہ ہے کہ جن تضادات کو لے کر وہ اقبال پر اعتراض کرتے ہیں وہ فراق میں بھی تھے اور ہر مفکر شاعر کے یہاں پائے جاتے ہیں اور یہ کوئی عیب نہیں ہوتا۔ گور سے دیکھا اور سمجھا جائے تو چند اعتراضات تو فراق کی اسی پیچیدہ ذہنیت کی غمازی کرتے ہیں۔ اس سے زیادہ فکری اور شخصی تضادات سے پر ہے۔ فراق کی شخصیت اور شاعری جس پر خوب لکھا گیا لیکن پھر بھی فراق کی شاعرانہ عظمت پر فرق نہیں آتا۔

میں یہاں ایک اور نکتہ پر بات کر کے اپنی بات ختم کروں گا اور وہی فراق کا اصل مسئلہ ہے، شکایت ہے، درد ہے کہ اقبال صرف مسلمانوں کی فکر کیوں کرتے ہیں اور وہ اپنی شاعری میں اسلامیات کا تذکرہ کیوں کرتے ہیں۔ ہر بڑے شاعر کی شاعری کسی نہ کسی نظریہ پر ٹکی ہوتی ہے جس کے پردہ میں اس کا اپنا مذہب تہذیب، معاشرہ کام کرتا ہے۔ اقبال مسلمان تھے۔ اُنھوں نے اپنے مسلمان ہونے کا بے باکانہ و ایماندارانہ اعتراف کیا ہے لیکن اس کے ساتھ یہ بھی کہا ہے۔ ''میرا ذاتی طریق یہ ہے کہ میں دنیا کی تمام مذہبی تحریکوں کو ادب و احترام سے دیکھتا ہوں۔ گو یہ احترام مجھے ایسی تنقید سے باز نہیں رکھتا جس کی بنا پر دیانت ہو اور جس میں سوائے خلوص کے اور کچھ نہ ہو۔''

پریم چند جیسا عظیم فن کار پہلے آریہ سماجی تھا اس کے بعد گاندھی وادی۔ ان کے افسانوں میں یہ بنارس، گورکھپور، الہ آباد وغیرہ کا علاقہ اور ماحول بول رہا ہے۔ عام دیہاتی انسان اور کسان ہیں لیکن مسائل عالمی اور انسانی و اخلاقی قدروں کے ہیں۔ خود فراق ایسے شعر کہتے ہیں۔:

ہر لیا ہے کسی نے سیتا کو
زندگی جیسے رام کا بن باس
دلوں میں تیرے تبسم کی یاد یوں آئی
کہ جگمگا اُٹھیں مندروں میں چراغ

فراق کی رباعیوں میں سنسکرت کا سرنگارس رچا بسا ہے۔ جنھیں سب اردو والوں اور مسلمانوں نے پسند ہی کیا اور اسے اردو شاعری میں اضافے کے طور پر لیا۔ کوئی سوال کر سکتا ہے کہ ان رباعیوں میں مسلمان مرد عورت کیوں نہیں۔ لیکن یہ سوال غلط ہوگا اور نامناسب بھی اس صورت میں اقبال اور اسلام کے رشتوں کو لے کر فراق کے سوالات بھی ناموزوں اور نامناسب ہیں۔ جو جہاں کا ہے پہلے وہیں کی تصویر پیش کرے گا۔ یہ ایک فطری عمل ہے جو بعد میں فکری عمل سے وابستہ ہو جاتا ہے۔ جو جہاں کا ہے اگر وہیں کا نہیں ہے تو پھر کہیں کا نہیں ہے۔ دیکھنا یہ چاہیے کہ ان میں عالمی افکار اور آفاقی اقدار کام کر رہے ہیں اور اس کی گونج مقامی و مذہبی دائروں سے نکل کر کس طرح عالم انسانیت کو متاثر کر رہی ہے اور اس کی حقیقت و افادیت کا دائرہ کس قدر وسیع ہے۔ کوئی مانے یا نہ مانے لیکن یہ ایک بہت بڑا سچ ہے کہ آفاقیت، مقامیت کے بطن سے جنم لیتی ہے اور بڑی حقیقی شاعری ارضی و مقامی اقدار سے آفاقی اقدار کا سفر طے کرتی ہے یعنی زمین سے آسمان کا سفر۔ جو لوگ سیدھے آسمان کی طرف دیکھتے ہیں او بڑی سے بڑی پرواز کا مطالبہ کرتے ہیں وہ اکثر منھ کے بل زمین پر گرتے ہیں۔ میں اپنی بات علی سردار جعفری کے ان جملوں پر ختم کرتا ہوں۔

> ''اقبال مسلم بیداری کے شاعر تھے۔ اس میں ایشیائی بیداری شامل ہے۔ اقبال ہندوستان کی بیداری کے شاعر تھے۔ اس میں پوری تحریک آزادی شامل ہے۔ اقبال عالم انسانیت کے شاعر تھے اس میں اشتراکیت کی فتح اور مارکس اور لینن کے افکار کی عظمت شامل ہے۔ اقبال کی دوسری یا تیسری حیثیت ان کی پہلی حیثیت کی تردید نہیں کرتی بلکہ میرے نزدیک اس کی توثیق اور توسیع کرتی ہے کیونکہ ہندوستان اور ایشیا کی مسلم بیداری، عالم انسانیت کی بیداری کا ایک حصہ ہے اقبال صحیح معنوں میں عالمی شاعر تھے۔''

○○○